شعبۂ تخصص فی الحدیث

مقصد اور منہج

از

محمد معاویہ سعدی

شعبۂ تخصص فی الحدیث، مظاہر علوم، سہارنپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شعبۂ تخصص فی الحدیث

مقصد اور منہج

الحمدللہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین، وعلی من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین، وبعد:

محترم بندہ! بعد سلام مسنون!

آں جناب نے شعبۂ "تخصص فی الحدیث" کے نصاب ونظام سے متعلق جو اِستفسار حضرت الاستاذ مولانا محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں، صاحبزادہ محمد قاسم سلمہ کے واسطہ سے کیا تھا، حضرت والا مدظلہم کی طرف سے اُس کے جواب کی خدمت احقر کے سپرد کی گئی تھی، جواب تو اُسی وقت لکھ لیا گیا تھا، مگر نظر ثانی کا موقع نہ ہو سکا تھا، بہر حال بتوفیقہ تعالیٰ وعونہ اَب جو کچھ حاضر ہے پیش خدمت ہے:

تمہید:

ا:- کسی بھی ادارہ یا شعبہ کا نصاب ونظام اُس کے مقاصد اور اہداف کی تعیین کے بعد ہی طے کیا جاسکتا ہے، اِس لیے سب سے پہلے مقصد کی تعیین اور ہدف کی نشاندہی ضروری ہے۔

۲:- اِس شعبہ میں داخل ہونے والے طلبہ کی علمی ترقی سے زیادہ، اُن کی عملی تربیت اور فکری تحفظ کی طرف توجہ دینا اَہم ہے، اس لیے کہ آج کل آزاد فکری، اور ائمۂ مجتہدین وسلفِ صالحین سے بے اعتمادی: بالعموم آزادانہ طور پر مطالعۂ حدیث سے اور اِس فکر کے حاملین کی (مختلف موضوعات پر لکھی گئی) کتابوں کے پڑھنے سے پیدا ہو رہی ہے۔

اِس لیے ہمارے بعض بزرگوں کا ذوق تو یہی رہا ہے کہ طلبہ کو ایسی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ہی نہ دیا جائے، مگر آج کل یہ چیز چونکہ مشکل ہو چکی ہے، بلکہ خالی الذہن رہنا بعض مرتبہ زیادہ مضر ہو سکتا ہے، اِس لیے بقدرِ استطاعت علمی، عملی اور فکری تحفظات کی ضمانت کے ساتھ اِس شعبے کے نظام اور قیام کی سعی کی جاسکتی ہے۔

۳:- یہاں شیخین جلیلین: حضرت مولانا عبد الرشید صاحب نعمانیؒ (سابق رئیس قسم التخصص فی الحدیث الشریف جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن) اور حضرت الاستاذ مولانا محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم العالیہ (شیخ الحدیث، ونگران حال شعبۂ تخصص فی الحدیث الشریف جامعہ مظاہر علوم) کے مابین ہونے والی اُس مکاتبت کا ایک اقتباس پیش کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا، جو حضرت الاستاذ مدظلہم نے مقدمہ ''الدر المنضود'' کے ضمیمہ میں (۱/۲-۱۴) درج فرمائی ہے۔

حضرت مولانا نعمانیؒ، حضرت الاستاذ مدظلہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یاد آتا ہے کہ تخصص فی الحدیث کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا تھا۔ محترما! تخصص تو وہ ہے جو شیخ کی خدمت میں رہ کر حاصل ہو، جیسے آپ کو حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں رہ کر حاصل ہوا، یا حضرت شیخؒ کو حضرت سہارنپوریؒ کی خدمت میں رہ کر حاصل ہوا۔

تجربہ بتاتا ہے کہ درجۂ تخصص کھولنے سے طلبہ کے دو سال اور لگ جاتے ہیں، اور حاصل کچھ نہیں ہوتا، بس وہی طالب علم فائدہ حاصل کرتا ہے جو اُستاد کا ہو رہے''۔

اِس کے جواب میں حضرت الاستاذ دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''جناب نے اِس مکتوبِ گرامی کے اخیر میں شعبۂ تخصص فی الحدیث کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے، اُس سے متعلق عرض ہے کہ اصل چیز تو وہی ہے جو جناب نے تحریر فرمائی، کہ تخصص تو وہ ہے جو شیخ کی خدمت میں رہ کر حاصل ہو، باقی اِس شعبہ کا فائدہ یہ ذہن میں ہے کہ طالب علم کو دو سال تک استادِ حدیث کی خدمت میں رہ کر (وہ) کتبِ حدیث جو اَب تک نہیں پڑھی ہیں، اور نہ اُس کی نظر سے گذری ہیں، وہ سامنے آئیں تو ہوسکتا ہے؛ اِس کوشش کے ذریعہ کسی خوش قسمت کو اِس فن میں آگے بڑھنے کا شوق پیدا ہوجائے، اور وہ اِس میں لگ جائے، گویا اُس کو لائن پر لانا مقصود ہے۔

لیکن اگر کوئی اِس شعبہ سے فارغ ہو کر یہ سمجھنے لگے کہ اَب میں 'محدّث'' بن گیا تو یہ اُس کی نادانی ہے، اور ایسے شخص کے لیے اِس شعبہ میں داخل ہونا ہی مضر ہے، اصل چیز سچی طلب ہے، اگر اِس شعبہ میں داخل ہونے سے کسی میں وہ پیدا ہوجائے تو یہ بہت بڑا فائدہ ہے''۔ (انتہی بلفظہما)

۴:- اِس طرح کے تمام دینی کاموں، بالخصوص اجتماعی خدمات کی انجام دہی کے لیے، ایک اہم ہدایت اور مشعلِ راہ ہمارے شعبہ کے سابق رئیس، استاذِ گرامی محدثِ کبیر حضرت مولانا زین العابدین صاحب اعظمی معروفی رحمہ اللہ کی وہ آخری وصیت ہے جو آپ نے اپنے مرض الوفات میں شعبہ کے رفقاء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائی تھی:

''ہمارا یہ شعبہ (تخصص فی الحدیث) تواضع ہی سے کامیاب ہوا ہے، اور جب تک یہ چیز باقی رہے گی، ترقی ہوتی رہے گی''۔ یہ بھی فرمایا کہ ''شعبہ کے سب لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھیں، کوئی اپنے کو بڑا سمجھ کر اپنے کو

کسی چیز کا مستحق نہ سمجھے"۔

لہٰذا کوشش ہونی چاہیے کہ شعبۂ "تخصص" کا ذمہ دار کسی صالح، متبعِ سنت، مشفق، متواضع، اور محقق وصاحبِ بصیرت عالم کو بنایا جائے، جو طلبہ کی علمی، عملی اور فکری ہر طرح کی رہنمائی، نگرانی اور تربیت کرسکتا ہو، **وباللہ التوفیق، وھو المستعان۔**

تین اہم مقاصد:

احقر کے نزدیک علمِ حدیث کی ضرورت کے پیشِ نظر، اور حالات ومسائل کے تقاضوں کے تحت اِس دور میں شعبۂ "تخصص فی الحدیث" کے قیام کے تین بنیادی مقاصد ہوسکتے ہیں:

ا: فن، اَصحابِ فن اور کتبِ فن کا تعارف، اُن سے مناسبت، اور فن کے تعلق سے پیش آنے والی مشکلات کا حل۔

اِس مقصد میں لگنے والوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مبارک دعا اور بشارت موجود ہے:

نضر اللّٰہ امرءاً سمع منا شیئاً، فبلّغه کما سمع، فرب مُبلَّغ أوعی من سامع [ترمذی: ۲۶۵۷، عن ابن مسعودؓ، وقال: حسن صحیح].

(اللہ تروتازہ رکھیں اُس شخص - یا اُس جماعت - کو جو ہماری طرف سے کوئی بات سنے، پھر اُس کو بلا کم وکاست دوسروں تک پہنچادے، کیوں کہ بعض مرتبہ جس کو بات پہنچائی جاتی ہے وہ سننے والے سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے)۔

۲: تفقہ فی الدین اور حدیث سے متعلق فقہی مذاہب کے درمیان مقارنہ کی صلاحیت پیدا کرنا، اور اِس کے ذریعہ حدیث اور عمل بالحدیث کے نام پر اُمت میں فکری اضطراب اور عملی انتشار پھیلانے والوں، اور فقہِ متوارَث اور تقلیدِ ائمہ کے منکرین کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات دینا۔

تفقہ فی الدین حاصل کرنے والوں کے لیے بھی حدیثِ پاک میں وارِد یہ عظیم خوش خبری موجود ہے:

"مَن یُرِد اللّٰہ به خیراً یُفقِّهه في الدِّین" [بخاری: ۷۱، ومسلم: ۱۰۳۷]. (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں اُس کو دِین کی صحیح سمجھ عطا فرمادیتے ہیں)۔

۳: ملحدین اور منکرینِ حدیث کی طرف سے پیدا کیے جانے والے شکوک وشبہات کا رد کرنے کی طرف توجہ۔

جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ہے: **یَحمِل ھذا العلم مِن کل خَلَف عُدولُه: یَنفون عنه تحریف الغالین، وانتحال المبطلین، وتأویل الجاھلین [مشکل الآثار: ۳۸۸۴، والحدیث بطرقه حسن].**

(یہ علمِ دین: ہر زمانہ کے ثقہ اور عادل لوگ حاصل کرتے رہیں گے، اور اس کے ذریعہ دین میں غلو کرنے

والوں کی تحریفات، اہلِ باطل کے غلط دعاوی، اور جاہلوں کی الٹی سیدھی تاویلات سے دین کو بچاتے رہیں گے)۔

پہلا مقصد:

(۱) اِن تینوں مقاصد میں سے پہلے مقصد کے حصول کے لیے تو: متنِ حدیث، شرحِ حدیث، اُصولِ حدیث، تخریجِ حدیث، حکم علی الحدیث، عللِ حدیث، اسماء الرجال، اُصول الجرح والتعدیل کے فنون پر مشتمل متقدمین ومعاصرین کی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، البتہ داخلِ درس کرنے اور نصاب کو طلبہ کے لیے مفید سے مفید تر بنانے کے لیے اِس عظیم الشان علمی ذخیرہ میں سے اِنتخاب بہت اہم مرحلہ ہے۔

منہج:

اِس لیے اپنے معمولی اور ناقص تجربے کی روشنی میں کچھ باتیں عرض کی جاتی ہیں:

اُ: **متنِ حدیث:** چونکہ تخصص فی الحدیث کے طلبہ، دورۂ حدیث میں کتبِ ستہ اور اس سے پہلے مشکوۃ شریف پڑھ کر آتے ہیں، اِس لیے اگر "متنِ حدیث" کا مضمون مختصر کر دیا جائے اور کچھ اَہم منتخبات پڑھا دیئے جائیں جب بھی کچھ حرج نہیں، مثلاً "الفیۃ الحدیث"، "زجاجۃ المصابیح" وغیرہ۔

ہمارے ہاں دوسالہ نصاب میں (کتبِ ستہ: بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، موطأ مالک، اور زوائدِ ستہ: مسند احمد، بزار، ابویعلی، معجم طبرانی کبیر، اوسط، صغیر، اور سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی، جیسی چودہ کتابوں سے ملخص، آٹھ ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل مجموعہ) "جمع الفوائد" داخلِ نصاب ہے۔

اِسی کے ذیل میں "حفظِ اَحادیث" کا بھی اہتمام ہونا چاہیے، بقول حضرت الشیخ محمد عوامۃ حفظہ اللہ کم ازکم تین سو اَحادیث، جن کا انتخاب تمام اَبواب سے کرلیا جائے، بتوفیقہ تعالیٰ ایک مجموعہ یہاں بھی مرتب کیا گیا ہے، جو ابھی قلمی ہے، ہر سال طلبہ اُس کو نقل کر لیتے ہیں۔

ب: **شرحِ حدیث:** متنِ حدیث کا جتنا حصہ پڑھایا جائے، اُن کی شرح کے لیے طلبہ کو متداول شروح کی طرف مراجعت کرائی جائے، جس میں حلِ حدیث، غریبِ حدیث اور فقہی مضمون کو بطورِ خاص پیشِ نظر رکھا جائے۔

(۱) حل حدیث کے لیے: شرح النووی، فتح الباری، مرقاۃ المفاتیح، فیض القدیر، بذل المجہود اور اوجز المسالک، وغیرہ انتہائی اہم ہیں۔

(۲) غریب الحدیث کے لیے متعلقہ شروح کے ساتھ ساتھ "النھایۃ فی غریب الحدیث"، "مجمع بحار الانوار"، اور "تاج العروس" کی بھی مراجعت بہت مفید ہے۔

(۳) فقہی مضامین کے لیے متعلقہ کتابوں کی تفصیل "دوسرے مقصد" کے ذیل میں آرہی ہے، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

ج: اُصولِ حدیث: اس نوع کی اہم کتابوں میں: "مقدمة ابن الصلاح"، "الاقتراح" لابن دقيق العيد، "الموقظة" للذهبي، "اختصار علوم الحديث" لابن كثير، "نكت الزركشي على ابن الصلاح"، "التبصرة والتذكرة"، و"التقييد والإيضاح" للعراقي، "النكت على ابن الصلاح"، و"نخبة الفِكَر مع نزهة النظر" للحافظ ابن حجر، "النكت الوفية" للبِقاعي، "فتح المغيث" للسخاوي، اور "تدريب الراوي" و"البحر الذي زخر" للسيوطي مانی جاتی ہیں۔

"مقدمة" اور "تدريب" میں سے کوئی ایک داخلِ درس کرلی جائے، اور "فتح المغيث"، یا "التبصرة" مطالعہ میں رکھ دی جائے۔

جب کہ ہر اہم بحث اور مسئلہ کے لیے متقدمین کی اصل کتابوں اور مراجع کی طرف مراجعت کا خاص اہتمام کرایا جائے، بالخصوص: "المحدِّث الفاصل" للرامهرمزي، "معرفة علوم الحديث" للحاكم، اور "الكفاية" للخطيب کی طرف۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اُصولِ حدیث کی یہ مذکورہ تمام کتابیں فقہِ شافعی کے تناظر میں ہیں، کہ اِن سب کی اصل سیدنا الامام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الرسالة" ہے، لہٰذا یہ کتابیں صرف محدثین کی اصطلاحات سمجھنے اور سمجھانے کے نقطۂ نظر سے پڑھائی جانی چاہئیں، اور حدیث فہمی، یا قبول وعدمِ قبول کا حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اِن اصولوں کو فقہِ حنفی کے نقطۂ نظر سے پڑھا جائے۔

اِس لیے کہ حنفیہ "خیر القرون" ہی میں فقہ وحدیث اور اُصولِ فقہ وحدیث کی تدوین سے فارغ ہو چکے تھے، جب کہ شافعیہ اور دیگر محدثین کے اُصول کی تدوین "فشوِّ کذب وخیانت" کے دور میں (دوسری صدی کے اواخر میں) ہوئی ہے، لہٰذا دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے حالات کا لحاظ رکھا، اور ظاہر ہے کہ پچھلوں کے بنائے ہوئے اُصول سے اگلوں کو مجوج نہیں کیا جاسکتا۔

حنفیہ کے لیے "فقہی" کے ساتھ ساتھ، بنیادی طور پر "حدیثی" اُصول وہ ہیں جو اِمام ابو یوسفؒ [ت: ۱۸۲ھ] اور اِمام محمدؒ [ت: ۱۸۹ھ] کی اُصول وفروع کی کتابوں سے اَخذ کر کے، اِمام محمد کے شاگردِ رشید قاضی عیسی بن ابانؒ [ت: ۲۲۱ھ] نے "الحُجَج الصغير" اور "الحُجَج الكبير" میں باقاعدہ طور پر مدوَّن فرمائے، پھر اُن سے بالواسطہ اِمام ابوالحسن کرخیؒ [ت: ۳۴۰ھ] نے وہ اُصول اَخذ کیے، اور ایک مختصر رسالہ تصنیف فرمایا۔

پھر ان تمام حضرات سے استفادہ کرتے ہوئے: علامۃ الاحناف حافظ الحدیث الفقیہ الأصولی اِمام ابو بکر جصاص رازیؒ [۳۷۰ھ] نے اپنی بے نظیر اور مایۂ ناز کتاب "الفصول في الأصول" میں "باب الكلام في الأخبار" کے تحت (۳/۱۳تا۲۴۷) وہ تمام اُصول نہایت شرح وبسط کے ساتھ، مع اَمثلہ واَدِلّہ کے جمع فرمادیے۔

پھر قاضی ابوزید دبوسیؒ [ت: ۴۳۰/۴۳۲ھ] نے "تقویم الأدلة "میں، امام ابوالحسن بزدویؒ [ت: ۴۸۲ھ] نے "کنز الوصول إلی معرفة الأصول "میں، اور آخر میں امام ابوبکر سرخسیؒ [ت: فی حدود ۴۹۰ھ] نے "کتاب الأصول "میں "کتاب السنة" کے تحت یہ تمام اُصول پوری طرح سے محقق اور مدلل فرما دیئے ہیں۔

پھر ان سب کے علوم ومعارف کو شیخ علاؤالدین عبدالعزیز البخاریؒ [ت: ۷۳۰ھ] نے اپنی شاہکار تصنیف "کشف الأسرار عن أصول البزدوي "میں نہایت شاندار انداز میں سمودیا ہے۔

اِس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی اہم اور قیمتی کتابیں اور مآخذ ہیں جن سے اِس موضوع کے سلسلے میں اِستفادہ کیا جانا ضروری ہے، خصوصاً اُصول البزدوی کی شروح میں "الکافي" للصِّغناقي، و"التقریر" للبابرتي، اِسی طرح متون میں سے "المنتخب" للحُسامي، "مَنار الأنوار" للنسفي، اور اُس کی شروح وحواشی، "بدیع النظام" لابن الساعاتي، علامہ ابن الہمام کی "التحریر"، اُس کی شرح "التقریر والتحبیر" لابن أمیر الحاج۔

پھر آخر میں ہندی علماء میں سے، شیخ محب اللہ بہاریؒ کی "مسلَّم الثبوت"، اور اُس کی شرح "فواتح الرحموت" للشیخ عبد العلي الأنصاري میں، شیخ محمد حسن سنبھلیؒ کے "مقدمة تنسیق النظام في شرح مسند الإمام" میں، علامہ شبیر اَحمد عثمانیؒ کے مقدمہ "فتح المُلهِم "موسومہ: "مبادیء علم الحدیث" میں، علامہ ظفر اَحمد تھانویؒ کے مقدمہ "اِعلاء السنن" بنام: "قواعد في علوم الحدیث" میں، اور حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کے "مقدمة أوجز المسالک" میں بھی حنفیہ کے یہ اُصولِ حدیث کافی حد تک جمع اور منقح ہوگئے ہیں۔

اور اِس زمانے میں فاضلِ گرامی، محقق اُصولی، شیخ عبدالمجید الترکمانی حفظه الله تعالیٰ ورعاہ نے متقدمین ومتاخرین کی تمام قابلِ ذکر کتابوں کو اچھی طرح کھنگال کر، ان میں موجود تمام متعلقہ اہم مباحث کو یکجا کیا، پھر ان کا انتہائی دقیق اور شاندار دِراسہ، اور نہایت جز رَسی کے ساتھ بہترین تحلیل وتجزیہ کیا، پھر ان کو "اُصولِ حدیث" کی متداول ترتیب پر مرتب فرما کر، ہر ہر مسئلہ کو اچھی طرح مہذب، منقح اور محرر کردیا ہے، فجزاه الله تعالی عنا وعن جمیع طلاب العلم وأهلِه خیر ما یجزي به المحسنین المخلِصین۔

اِس طرح سے جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی میں تخصص فی الحدیث الشریف کے ایک طالب علم کا "دِراسات في أصول الحدیث علی منهج الحنفیة "کے نام سے یہ مقالہ، اپنے موضوع پر ایک اعلیٰ شاہ کار، اور اِنتہائی محقق ومستند ماخذ ومرجع کی حیثیت اختیار کرچکا ہے، اور اَب تو نابغۂ عصر حضرت الشیخ محمد عوامہ دامت برکاتہم نے بھی اس کتاب کی تصدیق فرما کر اس کو سندِ اعتبار بخش دیا ہے۔

اس لیے یہ کتاب ہمارے اِداروں میں داخل نصاب ہونی چاہیے، بلکہ تخصص فی الحدیث سے پہلے ہی، اگر مشکوۃ شریف کے سال میں ''اُصول حدیث'' کا ایک مستقل گھنٹہ مقرر کر کے، اولاً ''مقدمہ مشکوۃ''، ثانیاً ''شرح نخبۃ الفکر''، اور آخر میں سات سو صفحات پر مشتمل یہ مقالہ بھی پڑھا دیا جائے، تو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے موجب بصیرت اور باعثِ طمانینت ہو۔

(بلکہ یہ پڑھ کر اور سن کر مسرت ہوئی کہ بعض اِداروں میں یہ محققانہ اور فاضلانہ کتاب داخلِ نصاب ہو بھی گئی ہے، فللّٰہ الحمد)۔

خلاصہ یہ کہ حنفیہ کے روایت و درایت ہر دو لحاظ سے ''اُصولِ حدیث'' محدثین سے فی الجملہ مختلف اور جزوی طور پر مستقل ہیں، ایک حنفی طالب علم کو اس پر متنبہ رہنا چاہیے۔

حنفیہ کے یہ اُصولِ فقہ: متقدمین، بالخصوص ہمارے اکابرِ دیو بند پر کافی روشن تھے، جس کا اندازہ اِمام گنگوہیؒ کے اَمالی، حضرت سہارنپوریؒ کے اِفادات، علامہ کشمیریؒ کی تحقیقات، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تدقیقات، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کے جوابات، اور خاتمۃ المحدثین حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی آراء اور ترجیحات سے بخوبی ہوتا ہے، کہ اِن تمام اکابر رحمہم اللہ نے اَحادیث کو اُصولِ اَحناف کی روشنی میں سمجھا، اور سمجھایا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں فقہِ حنفی و تقلیدِ اَئمہ کے سلسلے میں کمال درجہ کا تصلب اور انشراح پایا جاتا ہے۔

اِس کے برخلاف جو حضرات خاص فقہ شافعی کے تحت مدون کردہ اصولوں کو مطلق ''اُصولِ حدیث'' سمجھتے ہیں، پھر ان کے تناظر میں فقہ حنفی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ سخت اِضطراب اور اِشکالات کا شکار ہو جاتے ہیں، اُن کے ہاں اِس طرح کے جملے بکثرت آتے رہتے ہیں کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول آ گیا، آپ کی حدیث آ گئی، تو ابو حنیفہ کی تقلید کا کیا مطلب؟''، حالاں کہ اُن کی یہ بات بھی ''تقلید'' ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے، کہ وہ غیر شعوری طور پر قبولِ حدیث، پھر فہمِ حدیث دونوں مرحلوں میں ''اُصولِ شوافع'' یا ''اُصولِ محدثین'' سے متاثر ہوتے ہیں۔

مثلاً حنفیہ و شافعیہ (یا محدثین) کے درمیان مختلف فیہ ایک اہم اُصول ''حدیثِ صحیح'' کی تعریف ہے:

حدیث صحیح کی تعریف میں حنفیہ و شافعیہ (ومحدثین) کا اِختلاف:

اِس میں شافعیہ کے ہاں صحتِ حدیث کے لیے پانچ شرطیں ہیں:

(۱) عدالتِ راوی (۲) ضبطِ راوی (۳) اتصالِ سند (۴) شذوذ سے اور (۵) علت سے حفاظت۔

۱) عدالت: اِس میں حنفیہ: قرونِ اُولی کے راویوں میں ثبوتِ عدالت کے لیے ''منافیٔ عدالت'' کا نہ پایا جانا کافی سمجھتے ہیں (اور یہی بہت سے محققین محدثین کی بھی رائے ہے)، جب کہ عام شافعیہ و محدثین ثبوتِ عدالت کو ہی شرط قرار دیتے ہیں۔

اِسی طرح ''جہالت'' کا مدار: شافعیہ وغیرہ محدثین کے مشہور قول کے مطابق راوی سے روایت کرنے والوں کی قلت وکثرت پر ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک راوی کی روایت کی قلت وکثرت اور اس کے اشتغال علمی کے ہونے، نہ ہونے پر ہے، اور یہی محققین محدثین کی ایک جماعت کی بھی رائے ہے۔

۲)ضبطِ راوی: اگر روایت حافظہ سے بیان کی جارہی ہے تو ''استمرارِ حفظ'' کی شرط، اگر کتاب سے بیان کی جارہی ہے تو ''حفاظتِ کتاب'' کی شرط، اور اگر ''روایت بالمعنیٰ'' ہے، تو اس کی ذیلی شرائط میں جو تفصیلات اور اِختلافات ہیں؛ وہ اُصول کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۳)اِتصالِ سند: حنفیہ خیر القرون میں انقطاعِ سند کو علی الاطلاق مضر نہیں مانتے، بلکہ صرف قرونِ ثلاثہ کے بعد کے انقطاع کو مضر مانتے ہیں (اور یہ یاد رہے کہ خود اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی قرون ثلاثہ کے بعد ہی کے ہیں، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اصح قول کے مطابق قرنِ ثانی، یعنی دورِ تابعین کے ہیں)۔

اِسی کے تحت ''اِرسال'' کی بحث بھی ہے، جو اِس موضوع کے معرکۃ الآراء مباحث میں سے ہے، جس میں حنفیہ اور جمہور متقدمین ایک طرف ہیں، اور شافعیہ اور جمہور متأخرین دوسری طرف، حافظ ابوبکر جصاص رازیؒ نے اِس موضوع پر صحیح معنوں میں قلم توڑ دیا ہے، اور حدیثِ مرسل سے متعلق اِمام شافعیؒ کے تمام اِشکالات کا ایک ایک کرکے بہترین اور تسلی بخش جواب دے دیا ہے۔

شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے جصاصؒ اور سرخسیؒ ہی سے اِستمداد کرتے ہوئے ''الحدیث المرسل'' میں اِس مسئلہ سے متعلق حنفیہ کے مسلک کی وضاحت فرمائی ہے۔

۴)شذوذ: اِسی طرح شافعیہ کے یہاں شذوذ اور نکارت کا اطلاق کبھی تو: ''راوی کے کسی خاص سند یا الفاظِ متن میں اپنے سے اَوثق یا اکثر راویوں کی مخالفت کرنے'' پر ہوتا ہے، اور کبھی کسی بڑے اور مشہور اِمام سے کسی ایسے راوی کے تفرد پر ہوتا ہے جو اُس کا بہت زیادہ حاضر باش نہ ہو۔

جب کہ حنفیہ کے نزدیک: شذوذ تو کہتے ہیں کسی ایسے باب میں خبر واحد کا وارِد ہونا جس میں عموم بلویٰ ہو، ہر شخص کو اُس مسئلہ کی ضرورت پیش آتی ہو، پھر بھی اُس کو روایت کرنے والے صرف اِکا دکا ہوں، جیسے نقضِ وضوء بمسِّ ذکر۔

اور نکارت کہتے ہیں کسی ایسے باب میں خبر واحد کا وارِد ہونا جس میں اُس سے اَقوی اور اَثبت طریقہ سے کوئی اور مضمونِ شریعت یا اُصولِ دین مقرر ہوچکا ہو۔

پس شافعیہ کے ہاں شذوذ ونکارت کا مدار: اَوثق اور اکثر راویوں کی مخالفت پر ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک اَقوی واشہر مضمون اور اوثق واَثبت دلیل (کتاب اللہ، سنتِ متواترہ ومشہورہ) کی مخالفت پر ہے، اور ظاہر ہے کہ راوی کوئی بھی اور کتنا بھی ہو (جب تک شہرت اور تواتر تک نہ پہنچ جائے، اُس وقت تک) اُس کی

ثقاہت اور ضبط وعدالت کا جو بھی پیمانہ مقرر کیا جائے گا، وہ سب ظن اور احتمال ہی پر مبنی ہوگا، ایسے میں حنفیہ کے نزدیک شریعت کے مسلّمہ اُصول کو چھوڑنا، کسی بھی طرح جائز نہیں۔

۵) **علت:** اسی طرح محدثین کے ہاں "علت" کی تعریف کا حاصل ہے: کوئی ایسا مخفی قادح جو بادیٔ النظر میں سمجھ میں نہ آئے، بلکہ اس کے لیے روایت کے تمام طرق کی تخریج کرکے اس میں موجود اور مستور خلل کو دریافت کرنا پڑے۔

جب کہ حنفیہ کے نزدیک کسی خبر کے معلول ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ خود راویٔ روایت کی طرف سے بالجزم اس روایت کا انکار پالیا جائے، یا دیگر صحابہ وتابعین وتبعِ تابعین کا باوجود حاجت پیش آنے کے اُس سے اِعراض پایا جائے، یا اُس کے خلاف پر اجماع منعقد ہو جائے۔

بطور مثال اُصولِ حدیث کا صرف ایک مسئلہ ("حدیثِ صحیح" کی تعریف کا) یہاں ذکر کیا گیا، اگر صرف اِسی مسئلہ میں حنفیہ کی آراء کو اختیار کرلیا جائے، اور ایک حنفی مقلد کو یہی کرنا بھی چاہیے، تو ایسی سینکڑوں احادیث "حدیث صحیح" کی تعریف میں داخل ہو جائیں گی، جن پر ہم باوجود حنفی مقلد ہونے کے "اُصولِ شوافع" (یا اُصولِ محدثین) کی روشنی میں "ضعف" کا حکم لگاتے ہیں، جس کی بنا پر بہت ساری احادیث شاذ اور معلول قرار پاجاتی ہیں، اور ان کی بنیاد پر ہم کو حنفیہ کے مسلک پر اعتراض اور اشکال ہوتا ہے۔

لٰہذا "اُصولِ حدیث" کے عنوان کے تحت مذکورہ بالا کتابوں سے اِستفادہ، اصلاً کتبِ حدیث میں متداول اصطلاحات اور بحثوں کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ہونا چاہیے، اور "حدیث فہمی" کے لیے حنفیہ کی کتبِ اُصول میں "کتاب السنۃ" کی بحث کی طرف مراجعت ضروری ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں عرض کی جارہی ہے، علامۃ الاحناف الحافظ ابوبکر الجصاص الرازی الحنفیؒ نے بھی یہ بات فرمائی ہے: "**وليس طريقة الفقهاء في قبول الأخبار طريقةَ أصحاب الحديث، ولا نعلم أحداً من الفقهاء رجع إليهم في قبول الأخبار وردّها، ولا اعتبر أصولهم فيها**" (شرح مختصر الطحاوی ۲۴۴/۴)۔

اور یہ صرف حنفیہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اَحادیثِ اَحکام میں عام فقہاء کے اُصول بھی، محدثین سے فی الجملہ مختلف ہی ہیں، جیسا کہ اِمام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے مختلف مواقع پر اِس کی طرف اِشارہ کیا ہے۔

بلکہ حافظ ابن دقیق العیدؒ امام الشافعیۃ [ت:۷۰۲] نے تو کئی جگہوں پر اِس کی صراحت بھی فرمائی ہے، مثلاً: "**إن لكل من أئمة الحديث والفقه طريقاً غير طريق الآخر ......**" (شرح الإلمام ۲۷/۱)۔ ایسے ہی "الاقتراح" ص ۵ میں فرماتے ہیں: ...... **إن كثيراً من العلل التي يُعلّل بها المحدثون الحديث لا تجري على أصول الفقهاء ......، ومن شرطِ الحدّ أن يكون جامعاً ومانعاً .. إلخ۔**

البتہ یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ فقہاء اور محدثین کے درمیان کا یہ سب فرق صرف فقہی احادیث کے اندر ہے، نہ کہ فضائل و مستحبات میں، حافظ ابو بکر جصاص رازیؒ نے اِس پر بطورِ خاص تنبیہ فرمائی ہے:

وإنما قصد عيسىؒ – أي: ابن أبان – فيما ذكره إلى بيان حكم الأخبار الواردة في الحظر، أو الإيجاب، أو في إباحةِ ما قد ثبت حظرُه بالأصول التي ذكرها، أو حظرِ ما ثبت إباحتُه مما كان هذا وصفُه، فحكمُه جارٍ على المنهاج الذي ذكرناه في القبول أو الردّ.

وأما الأخبار الواردة في تبقية الشيء على إباحة الأصل، أو نفي حكمٍ لم يكن واجباً في الأصل، أو في استحبابِ فعل، أو تفضيل بعض القُرَب على بعض: فإن هذا عندنا خارج عن الاعتبار الذي قدمنا.

وذلک لأنه ليس على النبي صلى الله عليه وسلم بيانُ كل شيء مباح، ولا توقيف الناس عليه بنصٍ ذكرَه، بل جائز له تركُ الناس فيه على ما كان عليه حال الشيء من الإباحة قبلَ ورود الشرع.

وكذلک ليس عليه تبيينُ منازل القرب ومراتبها بعد إقامة الدلالة لنا على كونها قرباً، كما أنه ليس عليه أن يبين لنا مقادير ثواب الأعمال –أي على العموم–.

فلذک جاز ورودُ خبر خاص فيما كان هذا وصفُه، وتوقيفه بعضَ الناس عليه دون جماعتهم؛ حسب ما يتفق سؤال السائل عنه، أو وجود سبب يوجب ذكره، فيعرفه خواص من الناس، وينقلوه؛ دون كافتهم ......

("الفصول في الأصول" ۳: ۱۲۲، ونقله عنه الشيخ عبد المجيد التركماني في كتابه المانع النافع: "دراسات في أصول الحديث على منهج الحنفية" ص ۲۸۷ –۲۸۸)۔

اور یہی وہ موقع بھی ہے جس کے لیے حافظ العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے:

كان الإسناد لئلا يُدخل في الدين ما ليس منه، لا ليُخرَج من الدين ما ثبتَ منه مِن عمل أهل الإسناد [نقله عنه الشيخ أبو غدة – برواية العلامة البنوري عنه – في آخر "أجوبة الفاضلة" للعلامة اللكنوي، ص ۲۳۸].

(سند اور روایت کا نظام تو خارجی دخائل سے دِین کی حفاظت کے لیے قائم کیا گیا تھا، اِس لیے نہیں کہ جو چیزیں خود قرونِ اُولی کے معتبر راویوں اور اکابر دِین کے تعامل سے ثابت ہیں، اُنھیں صرف اپنی مزعومہ شرط پر سند نہ ملنے کی وجہ سے ردّ کر دیا جائے)۔

یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے بعض طبقات کی طرف سے "عمل

بالحدیث“ اور”عمل بالسنۃ“ کا ایسا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے جس سے عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جو حضرات: فقہاء اور ائمۂ مجتہدین کے فہم اور تفقہ پر اعتماد کر کے، اُن کے واسطے سے شریعت پر عمل کرتے ہیں، وہ خدانخواستہ ”عمل بالحدیث“ سے محروم ہیں۔

اِسی طرح اِس گم راہ کن پروپیگنڈہ کا بعض لوگوں پر ایک منفی اثر یہ بھی پڑا کہ وہ شرعی دلائل کو ”حدیث“ ہی میں محصور سمجھنے لگے، یا کم از کم دلائلِ اربعہ میں سے پہلے نمبر پر سمجھنے لگے، حالاں کہ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں بالاتفاق ”دلائلِ شرعیہ“ چار ہیں، اور اُن میں سے ”سنتِ رسول اللہ“ دوسرے نمبر پر ہے، اُس سے پہلے ”کتاب اللہ“ ہے۔

تو کسی بھی شرعی مسئلہ میں علی الترتیب دلائلِ اربعہ کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے، صرف ”حدیث“ کے دائرے میں رہنا، یا بطور دلیل صرف ”حدیث“ کا مطالبہ کرنا: یہ اہل السنۃ والجماعۃ کے طریقے سے شذوذ اور عدول ہے۔

اِسی طرح حدیث میں بھی مطلقاً سند کے ”صحیح“ ہونے کی قید لگانا: یہ بھی اُصولِ جمہور سے اِنحراف ہے، جیسا کہ اِس کی مزید وضاحت آیا چاہتی ہے، بتوفیق اللہ وعونہ۔

د: تخریج الحدیث، ودراسۃ الأسانید: طلبہ کو تخریجِ حدیث کا طریقہ سکھلانے اور اُصولِ تخریج سمجھانے کے لیے متقدمین کی کوئی باقاعدہ کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لیے معاصرین کی کتابوں میں سے دکتور ابواللیث خیر آبادی حفظہ اللہ کی ”تخریج الحدیث: نشأته ومنهجيته“ ہمارے ہاں داخلِ نصاب ہے، اور یہ اپنے موضوع پر کافی حد تک ایک مکمل اور جامع کتاب ہے، اس کتاب کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ، اس میں ذکر کردہ اُصول کا اِجراء، تخریج کی عملی مشق، اور مندرج کتابوں کا تعارف اور ان کی مراجعت وممارست بھی کرائی جائے۔

تخریج حدیث کے مختلف طریقے سیکھنے اور سمجھنے کے بعد حدیث کے دیگر طرق، متابعات اور شواہد کے تتبع اور جمع کا مرحلہ آتا ہے، پھر ملتقی الاسانید (مختلف اسانید کے مرکزی نقطہ) کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اسانید کے دِراسہ اور تحلیل کا مرحلہ آتا ہے۔

ھ: حکم علی الحدیث:

اس کے بعد حکم علی الحدیث کا مرحلہ ہے، جو بہت ہی نازک اور احتیاط طلب کام ہے، چنانچہ حافظ ہیثمیؒ وغیرہ بہت سے محدثین عموماً بحیثیتِ مجموعی حدیث پر حکم نہ لگا کر، صرف پیشِ نظر سند پر حکم لگانے پر اکتفا کرتے ہیں۔

دراصل کسی حدیث پر حکم لگانے کے لیے صرف رجالِ اِسناد کا دراسہ ہی کافی نہیں ہے، بلکہ جمیع ما فی الباب (من المرفوع والموقوف والمقطوع) یہاں تک کہ اقوالِ فقہاء اور آرائے ائمہ پر بھی مطلع ہونا ضروری ہے۔

پھر شذوذ اور علت کی معرفت بھی بہت اہم ہے، اِسی طرح تصحیح وتضعیف کے کچھ انفرادی اُصول اور کچھ

ذوقی قرائن بھی ہوتے ہیں، جوممارست ومہارت فی الفن سے روشن ہوتے ہیں،اس لیے اس باب میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

اِسی طرح محدثین کے ہاں یہ اُصول بھی مسلمات میں سے ہے کہ ''صحتِ اِسناد: صحتِ حدیث کومستلزم نہیں''، اوراِس کے برعکس ''ضعفِ سند: ضعفِ حدیث کوبھی مستلزم نہیں''، حضرت اِمام شافعیؒ نے بھی ''الرسالة'' ص ۳۹۹ میں اِس کی صراحت فرمائی ہے۔

معاصرین میں سے دکتورمقبل بن ہادی الوادِعی کی ایک کتاب ہے: ''أحادیث مُعلَّة ظاهرها الصحة''، جس میں انھوں نے اپنے ذوق اورمنہج کے مطابق پانچ سوسے زائدایسی احادیث جمع کی ہیں جن کی سند بظاہر صحیح ہے، مگر حدیث کسی نہ کسی لحاظ سے معلول ہے۔

سند کا صحیح یا ضعیف ہونا من جملہ قرائن کے ایک اکثری اورقوی قرینہ تو ہے، مگر کوئی حتمی دلیل اور قطعی حجت نہیں، قبول وعدمِ قبول کا اَصل معیار ہے: اُس حدیث کا ''معمول بہ'' یا ''غیرمعمول بہ'' ہونا، جیسا کہ حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے بطورِخاص اِس پر تنبیہ فرمائی ہے۔

اِسی لیے بعض مرتبہ سنداً کوئی ضعیف حدیث بھی معمول بہ ہوجانے کی بنا پر اتنی قوی ہوجاتی ہے کہ اُس سے کتاب اللہ پر زیادتی اورنسخ سب جائز ہوجاتا ہے۔

البتہ یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک **فقہی** احادیث میں (نہ کہ فضائل ومستحبات میں) قرونِ اُولی ثلاثہ ہی میں فی الجملہ عمل کا پایا جانا بھی شرط ہے، لہٰذا اگرکسی **فقہی** حدیث پر ابتدائی تین قرون میں بالکل بھی عمل نہیں پایا گیا تو بظاہر صحتِ سند کے باوجود، یہ اُس کے ''معلول'' ہونے کی دلیل ہوگی:

قال الإمام محمد بن عیسی الطباعؒ [ت:۲۲۴]: ''کُلُّ حدیثٍ جاءکَ عن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم؛ لم یَبلُغکَ أن أحداً مِن أصحابه فَعَلَه: فدَعْه'' (الفقیه والمتفقه للخطیب البغدادي ۱: ۳۵۴)۔

خطیبِ بغدادیؒ نے اِس کونقل کرکے وضاحت فرمائی ہے کہ اِس سے مرادایسی حدیث ہے جو اجماعِ اُمت کے خلاف ہو، بلکہ علامہ ذہبیؒ توخاص ائمۂ مجتہدین کے قبول کی بھی شرط لگاتے ہیں، فرماتے ہیں: **فأما مَن أخذ بحدیث صحیح وقد تنکّبه سائر أئمة الاجتهاد فلا** (سیر اعلام النبلاء ۱۶/۴۰۵)۔

حدیثِ ضعیف:

پھر ''ضعفِ سند'' کس حدتک قابلِ تحمل ہوسکتا ہے، اورکس حد کے بعدنا قابلِ تحمل ہوجاتا ہے؛ یہ مضمون بھی نہایت اہم اورنازک ہے۔

اِس سلسلہ میں بعض محققین نے محدثین کے منہج کے اعتبار سے حدیثِ ضعیف کے چار مراتب قائم

فرمائے ہیں:

۱: حدیثِ ضعیف خفیف۔۲: حدیثِ ضعیف متوسط۔۳: حدیثِ ضعیف شدید۔۴: موضوع۔

۱) ''حدیثِ ضعیف خفیف'' (جس میں لیّن الحدیث، مستور، مجہول الحال راوی ہو، اُس) پر باب الاحکام والمسائل میں بھی فی الجملہ عمل کرنا جائز ہوتا ہے۔

۲) ''حدیثِ ضعیف متوسط'' (جس میں ضعیف، منکر الحدیث، مردود الحدیث راوی ہو، اُس) پر فضائل میں مطلقاً عمل جائز ہے، اور مسائل میں صرف استیناس کی حد تک، کسی مسئلہ کی بنا اُس پر جائز نہیں۔

۳) ''حدیثِ ضعیف شدید'' (جس میں متروک، یا متہم درجہ کا راوی ہو، اُس) پر فضائل میں بھی عمل کی بنیاد رکھنا جائز نہیں، البتہ ایسی حدیث کو ترغیب و ترہیب، وعدہ وعید، قِصص واَمثال وغیرہ میں تین شرطوں کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے:

۱: اُس کے ضعف پر تنبیہ ضرور کی جائے۔

۲: اُس خبر میں وارِد مضمون کا حتمی اعتقاد نہ کیا جائے، بلکہ صرف اُس میں مذکور وعدہ کی توقع، یا ترہیب کا خوف پیشِ نظر ہو۔

۳: اِنہی دونوں نزاکتوں کی وجہ سے ایسی احادیث کی عوام میں زیادہ اِشاعت کے درپئے نہ ہوا جائے، کہ عوام یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھ پاتے، البتہ کتابوں میں عمومی انداز کے بیان میں کچھ حرج نہیں، جیسا کہ تعاملِ اکابر سے بھی یہ بات ظاہر ہے، اور حافظ ابن دقیق العیدؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے کلام سے بھی یہی نتیجہ مترشح ہوتا ہے، شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ اِس موضوع کو اپنی کتاب ''الحديث الضعيف: بين النظرية والتطبيق والدعوى'' میں محقق اور منقح فرمادیا ہے۔

۴) ''حدیثِ موضوع'' کو تو صحیح معنوں میں ''حدیث'' کہنا ہی مناسب نہیں، اور ایسی خبر کا حدیث کے طور پر بیان کرنا، ناجائز اور حرام ہے، اِس میں بہت اِحتیاط کی ضرورت ہے۔

یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ کسی سند میں صرف کسی کذاب یا وضاع راوی کے آجانے ہی سے اُس کا ''موضوع'' ہونا لازم نہیں آجاتا، حافظِ عراقیؒ فرماتے ہیں: ومع هذا فلا يلزم من وجود كذابٍ في السند: أن يكون الحديث موضوعاً، إذ مطلق كذب الراوي لا يدلّ على الوضع ......(التبصرة والتذكرة ۱:۳۰۷)۔

البتہ یہ اُس کے بطلان یا وضع پر من جملہ قرائن کے ایک قرینہ ضرور ہے، جس کے مؤثر ہونے نہ ہونے کا فیصلہ، موقع محل کے لحاظ سے کوئی ماہرِ فن ہی کرسکتا ہے۔

اِس کے برعکس ہر معقول، یا ہر مطابقِ واقعہ بات کا قولِ رسول ہونا بھی ضروری نہیں، اِمام مزیؒ فرماتے

ہیں: ''**كل ما قاله رسول الله صلى الله عليه وسلم حقّ، وليس كل ما هو حق؛ قاله رسول الله صلى الله عليه وسلم**'' [کمافی حاشیۃ ''ظفر الامانی'' ص ۲۵۶، از: شیخ ابوغدۃؒ]۔
(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ساری باتیں برحق ہیں، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر حق بات آپ نے فرمائی بھی ہو)۔

اِسی طرح قاضی ابن جماعہؒ فرماتے ہیں: ''**إن المعوّل في ذلك هو النقل، وليس كل ما يجوّزه العقل يستلزم الوقوع**'' [الزیادات علی الموضوعات للسیوطی ۱/۳۲۸] (حدیث کے ثبوت کا مدار نقلِ صحیح پر ہے، لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز عقلاً جائز ہو وہ حدیثِ رسول بھی ہو)۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدۃؒ نے ''ظفر الأماني'' للکنوي کے حاشیہ میں (ص ۲۸۰-۲۸۱ پر) حدیثِ موضوع سے خوش ہونا، اور اُس سے اِستناد کی کوشش کرنا؛ ''بیمار ذہنیت'' کی علامت قرار دیا ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ بعض صوفیہ ومشائخ کے بعض معمولات ایسے ہوتے ہیں جن کی حدیث میں کوئی سند نہیں ہوتی، تو اگر وہ اُصولِ شریعت کے خلاف نہ ہوں، تو اُن کے اِختیار کرنے اور اُن کی تلقین کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ:

۱) اُن کو سنت کے طور پر نہ پیش کیا جائے۔

۲) اور اُس پر (از خود) کسی خاص ثواب، یا اجر کی تعیین نہ کی جائے۔

۳) اور اگر اُس باب میں کوئی ایسی خبر موجود ہو جس کے موضوع اور باطل ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے، تو اُس کی طرف استناد نہ کیا جائے۔

بہرحال! یہ موضوع بھی نہایت نازک اور افراط وتفریط کا خاص محل ہے، اگر ایک طرف عوام الناس، بلکہ بہت سے اہلِ علم بھی ''موضوع'' احادیث کے بیان میں بھی تساہل کا معاملہ کرتے ہیں، تو دوسری طرف بہت سے متشدد حضرات ''حدیثِ ضعیف'' کی ابتدائی تین قسموں کو بھی ''موضوع'' ہی کے حکم میں رکھ کر، مطلقاً رد کر دیتے ہیں۔

اِس سلسلہ میں متقدمین اور متاخرین، بالخصوص معاصرین کے ذوق میں جتنا فرق ہے، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حدیث شریف کی سینکڑوں وقیع ومعتبر کتابوں میں سے اِنتخاب کر کے جن چھ کتابوں (کتبِ ستہ) کو تقریباً متفقہ طور پر ''اُصولِ اسلام'' قرار دیا گیا تھا، بعض معاصرین نے اس کو نہایت بے باکی اور فخر کے ساتھ ''صحیح'' اور ''ضعیف'' کے دو خانوں میں بانٹ دیا ہے، اور اِس سلسلہ کو ایک خاص حلقہ میں پذیرائی بھی مل گئی ہے!! فإنا للہ۔

اِس موضوع کی مزید تفصیل کے لیے شیخ سعید ممدوح حفظہ اللہ کی چھ جلدوں پر مشتمل کتاب: ''التعریف

بأوهام مَن قَسَّم السننَ إلى صحيح و ضعيف ''بطورِ خاص قابلِ ملاحظہ ہے۔

یہاں ایک اور بھی اہم پہلو قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ بعض مرتبہ کوئی محدِّث اُسمائے رجال کی کتاب اور جرح وتعدیل کی بحث کے تناظر میں تو راوِی پر ''ضعف'' کا حکم لگا دیتا ہے، مگر جب کہیں اَبواب الاحکام میں ''مافی الباب'' کی ضمن میں اُس کی حدیث زیرِ بحث آتی ہے تو اُس پر مثلاً ''حَسَن'' کا حکم لگاتا ہے، تو یہ اُس کا تناقض، یا تساہل نہیں ہے، بلکہ فنی مہارت کی علامت ہے، کہ وہ نرے ضوابط کو ''عصی الأعمی'' (اندھے کی لاٹھی) کے طور پر نہیں استعمال کر رہا ہے، بلکہ دیگر قرائن اور مؤیدات کے پس منظر میں گفتگو کر رہا ہے۔

معاصرین میں سے جن حضرات نے اِس دقیق نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی، اُن میں سے بعض نے حافظ ابن حجرؒ جیسے امامِ حدیث کی طرف صرف اِس وجہ سے ''تناقض'' کی نسبت کر دی کہ حافظ صاحبؒ ایک راوی کو مثلاً ''تقریب التہذیب'' میں خود ہی ضعیف کہہ رہے ہیں، اور مثلاً ''فتح الباری'' میں اُسی راوی کے طریق سے آئی ہوئی حدیث پر ''حسن'' کا حکم لگا رہے ہیں۔

اور یہی وہ نکتہ بھی ہے جس کا لحاظ نہ کرنے سے امام ترمذیؒ پر ''تساہل'' کے حوالہ سے اِشکال کیا جاتا ہے، حالاں کہ اِمام ترمذیؒ کے لگائے ہوئے اَحکام غایت درجہ دقتِ نظری پر مبنی ہوتے ہیں، جیسا کہ شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم، دیوبند سے شائع ہونے والے ''سلسلۂ دراسات لأحکام الترمذی'' میں یہ بات محقق ہو چکی ہے۔

اِسی طرح حافظ ابن حجر کی شاہ کار تصنیف ''تقریب التھذیب ''جو جرح وتعدیل کے باب میں مسلمات میں سے ہے، اس میں مصنف کے مناشی اور مدارک تک رسائی نہ ہو پانے کی بنا پر بعضے معاصرین کو اس پر استدراک کی ضرورت محسوس ہوئی، اور انھوں نے چار جلدوں میں ''تحریر تقریب التھذیب'' لکھ ڈالی۔

جس پر بعض علماء نے اچھا تعاقب بھی کیا ہے، اِسی طرح دکتور ولید عانی مرحوم نے بھی اپنی شاہ کار تصنیف ''منھج دراسة الأسانید والحکم علیھا ''میں ''تقریب التھذیب'' کے بارہ مراتب، اور ہر مرتبہ کے راویوں کی جرح وتعدیل کا نہایت شاندار دِراسہ کر کے، حافظ صاحب کے مدارک کو مثالوں کے ذریعہ کافی حد تک واضح کر دیا ہے، اور ساتھ ہی ہر مرتبہ کے راویوں کی احادیث کا مرتبہ بھی متعین کر دیا ہے، اور اِس سلسلے میں شیخ احمد شاکر مرحوم وغیرہ کے بعض اقوال سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا اِزالہ بھی کر دیا ہے۔

اسی سے استفادہ کرتے ہوئے دکتور ابواللیث خیر آبادی نے ''تخریج الحدیث: نشأته و منھجیته'' میں اختصار کے ساتھ، اور ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا عبداللہ معروفی صاحب مدظلہم نے اولاً جامع ترمذی کے تین مختلف دراسات کے مقدمات میں، اور ثانیاً ''الأدب المفرد'' کی شرح وتخریج کے مقدمہ میں نہایت بسط کے ساتھ اس موضوع کو تقریباً مکمل اور منقح فرما دیا ہے۔

و: علل الحدیث: اِس موضوع سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ''علل الحدیث'' کے موضوع پر: امام ابن

المدینیؒ، احمدؒ، ابوعلی فلاسؒ، ابن ابی حاتمؒ اور دار قطنیؒ وغیرہم کی مستقل تصانیف تو ہیں ہی، ان کے علاوہ ضعفاء ومجروحین پر لکھی گئی کتابیں، اسی طرح تخریجِ احادیث پر مشتمل کتابیں بھی نہایت مفید ہیں۔

اِس لیے طلبہ کو تخریجِ حدیث کراتے ہوئے اِن تمام کتابوں کی مراجعت کی تشویق وترغیب دی جائے، اوران کو اس کا پابند بنایا جائے کہ حتی الامکان احادیث پر ازخود حکم نہ لگائیں، بلکہ انہی کتابوں کی مراجعت کر کے بقدرِ اِمکان ان سے کسی امام کا قول تلاش کر کے نقل کریں۔

ز: أسماء الرجال: کتبِ ستہ کے رجال کے لیے تو"**تهذيب الكمال**" اوراس کی فروع ہیں، ان کے علاوہ کے لیے: "**التاريخ الكبير**" **للبخاري**، "**التاريخ الكبير**" **لابن أبي خيثمة**، "**الجرح والتعديل**" **لا بن أبي حاتم**، "**كتاب المجروحين**" **لا بن حبان**، "**الكامل في الضعفاء**" **لابن عدي**، "**ميزان الاعتدال**" **للذهبي**، "**لسان الميزان**" **للحافظ ابن حجر** ، اِس موضوع کی اہم، مشہوراور بنیادی کتابوں میں سے ہیں۔

پھر ابن معین کی تواریخ، احمد ودار قطنی کے سوالات، اور تاریخ، تراجم، طبقات، سؤالات، علل اور تخریجِ احادیث کے موضوع کی دیگر کتابیں بھی اس فن سے مناسبت پیدا کرنے اور رجال ورواۃ کے احوال وکوائف کو سمجھنے اور مستحضر رکھنے میں مفید ومعین ہوں گی۔

اِس عنوان کے تحت ہم اپنے طلبہ کو مشاہیر ائمۂ حدیث، متکلمین فی الرجال اور منتخب راویوں کے احوال یاد بھی کرا سکتے ہیں، کم از کم اِتنا جس سے ان کی علمی اور استنادی حیثیت واضح ہوجائے، ہمارے ہاں تقریباً دوسو محدثین ورواتِ حدیث کے تراجم یاد کرائے جاتے ہیں۔

ح: أصول الجرح والتعدیل: تحفظِ دین اور حفاظتِ حدیث کے لیے حاملین علم اور راویانِ حدیث کے احوال کی تفتیش وتحقیق، اوراس کی روشنی میں عدالت وضبط کے اعتبار سے ان کی حدیث کے مرتبہ کی تعیین کا سلسلہ قرونِ اولیٰ سے جاری ہے، اوراسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے أسماء الرجال کا وہ منفرد اور بے نظیر فن مدوّن کیا گیا ہے جس کی مثال اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب میں پائی ہی نہیں جاتی۔

البتہ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ "اسماء الرجال" (اوراس کے متعلقات) کی جن کتابوں میں رجالِ حدیث پر کوئی نقد وتبصرہ کیا گیا ہے اور توثیق وتضعیف کے اعتبار سے کوئی حکم لگایا گیا ہے؛ ظاہر ہے کہ وہ ہر امامِ حدیث اور متکلم فی الرجال کے اپنے اپنے مذاق ومزاج، علمی بصیرت، تاریخی معلومات اور فقہی وکلامی مسلک پر مبنی ہے۔

اِسی اختلافِ مزاج، علمی فرقِ مراتب اور فقہی وکلامی رجحان کے نتیجہ میں ہر ایک کی جرح وتعدیل کی حیثیت بھی مختلف ہوجاتی ہے، اور جس راوی پر کلام کیا گیا ہے اس کی شخصیت پر وہ کتنا اثر انداز ہورہا ہے؟ یہ اسی کی معرفت پر مبنی ہے، اس لیے اِس موضوع سے مناسبت اور فن میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

(۱) جرح وتعدیل کے بنیادی اُصولوں کو جانا جائے۔

(۲) ہرامام کے مذاق ومزاج، علمی حیثیت، فقہی بصیرت اور مسلکی رنگ کی معرفت حاصل کی جائے۔

(۳) جرح وتعدیل کے اَلفاظ، ہر ایک کی تاثیر، اور مختلف احوال کے اعتبار سے ان کے وزن (گراف) کو معلوم کیا جائے۔

(۴) جن وجوہ کے پائے جانے سے کسی امام کی جرح ناقابل اعتبار ہوجاتی ہے، یا جس مقام ومرتبہ پر پہنچنے کے بعد کسی راوی پر جرح غیر مؤثر ہوجاتی ہے، یا جن ناقدین کی جرح زیادہ قابلِ التفات نہیں مانی جاتی ہے؛ اِس فن میں مہارت کے لیے اِن سب کی معرفت حاصل کرنا اور ان اُمور میں بصیرت پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔

(۵) یہاں یہ بات بھی بطورِ خاص محفوظ کرنے کی ہے کہ علمائے جرح وتعدیل کے ہاں:

۱: مزاج کے تفاوت کے اعتبار سے ائمۂ جرح وتعدیل کی تین قسمیں ہیں: متشدد، متساہل اور معتدل۔

۲: پھر فنی بصیرت اور وسعتِ نظری کے لحاظ سے دو قسمیں ہیں: عارف (جو اسبابِ جرح وتعدیل کی تحقیقی معرفت رکھتا ہو)، بصیر (جو فقہ وحدیث کا جامع، اقوالِ صحابہ اور اِختلافِ ائمہ سے اچھی طرح واقف، اور عقائد واَفکار کی تفصیلات اور اُن کے اَحکام سے پوری طرح باخبر ہو)، اور غیر عارف، یا غیر بصیر۔

۳: اِسی طرح جرح وتعدیل کی تین قسمیں ہیں: مبرہن، مفسر، غیر مفسر۔

۴: پھر راویوں کی چار قسمیں ہیں:

اول: جس کا ضعیف ہونا طے ہوچکا ہو، اِس کے بارے میں ہر جارح کی، ہر طرح کی جرح قبول کرلی جائے گی۔

دوم: جس کے اَحوال کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہوں، اور اُس کی روایت میں کوئی نکارت محسوس نہ ہو، اِس کے بارے میں عارِف بصیر کی کسی وضاحت کے طلب کیے بغیر بھی جرح مقبول ہوجائے گی، اور غیر عارف، یا غیر بصیر کی جرح بغیر وضاحت کے مقبول نہ ہوگی۔

سوم: جس کے بارے میں ائمۂ جرح وتعدیل میں اِختلاف ہوجائے؛ کوئی توثیق وتعدیل کرتا ہو، کوئی تضعیف وتجریح، اِس راوی میں عارفِ بصیر سے بھی وضاحت اور تفسیر کا مطالبہ ہوگا، اور غیر عارف یا غیر بصیر کی جرح کی طرف تو التفات ہی نہیں کیا جائے گا۔

چہارم: جس کی ثقاہت وعدالت اور امامت وسیادت معروف ومشہور ہوچکی ہو، ایسے راوی کے بارے میں عارفِ بصیر کی طرف سے بھی صرف وضاحت ہی کافی نہیں، بلکہ اُس پر دلیل وبیّنہ بھی قائم کرنا ضروری ہوگا، ورنہ جرح معتبر نہ ہوگی۔

اور اگر دونوں کے درمیان کسی طرح کی کوئی منافرت پائی گئی تو پھر تو عام حالات میں "بیّنہ" کا بھی اعتبار نہ ہوگا، الا یہ کہ قاضیٔ مسلمین ہی کسی شہادت کی بنیاد پر اُس کو مجروح قرار دیدے۔

(یہ سب تفصیلات علامہ سبکی شافعیؒ کی "قاعدة فی الجرح والتعدیل" اور اُس پر شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی

تعلیقات سے مأخوذ ہیں، بلکہ شیخ کی ''أربع رسائل'' مکمل ہی سے اِس طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔

(۶) حافظ ابن حبانؒ، عجلیؒ، ابن شاہینؒ، وغیرہم کی توثیق کی کتنی اہمیت ہے؟ بالخصوص جس راوی کے بارے میں دیگر ائمہ متقدمین کا کلام موجود نہ ہو؛ یہ بھی اِس موضوع کی بہت اہم اور قابل توجہ بحث ہے۔

شیخ اَلبانیؒ اور اُن کے متبعین ومتأثرین (کی بعض خوبیوں کے اعتراف کے باوجود، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان) کے ہاں اِس سلسلے میں جو بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں ہوئی ہیں؛ موجودہ علمی وفکری اِضطرابات وانحرافات کا وہ بھی ایک بڑا سبب ہیں۔

(۷) اسی طرح کسی راوی پر ''جہالت'' کا حکم لگانا، اور پھر اس کے نتیجے میں اس کی حدیث کو مطلقاً ''ضعیف'' قرار دیدینا؛ یہ بھی اِنتہائی نازک مقام ہے، اور اس جگہ پر بھی ان تمام ہی حضرات کے ہاں جمہور ائمہ محدثین کے طرز سے اختلاف (یا اِنحراف) پایا جاتا ہے۔

(۸) کسی راوی کی ثقاہت وعدالت معلوم کرنے کے لیے دو طریقے زیادہ مشہور ہیں:

۱-: تنصیص المزکّی (کسی اِمام کی تصریح)۔

۲-: اور اِستفاضہ (شہرتِ عامہ)۔

اور اس کے علاوہ جو طریقے ہیں وہ اُصول کی کتابوں میں ضمناً بیان کیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کوتاہ بیں اور عجلت پسندوں کی نظر اس کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتی، جس کے نتیجہ میں وہ ہر ایسے راوی کو مجہول سمجھ لیتے اور کہہ دیتے ہیں، جس کے بارے میں اول الذکر دو طریقوں میں سے کسی طریقہ سے توثیق وتعدیل نہ پائی جاتی ہو۔

حالانکہ توثیق وتعدیل کے اِثبات کے لیے اس کے علاوہ مزید کئی اور طریقے ہیں، جن سے بلحاظِ فرقِ مراتب: عدالت وثقاہت کا اِثبات کیا جاسکتا ہے (جس کی تفصیل بتوفیقہ تعالیٰ وعونہ احقر کے مقالہ: ''**الشیخ عبد الفتاح أبو غدة في ضوء تأليفاته وتحقيقاته**'' میں الحمدللہ آ گئی ہے)۔

حاصل یہ ہے کہ ''اُصول الجرح والتعدیل'' کو جاننا، اور نہایت گہرائی کے ساتھ اُن کو سمجھنا بہت اہمیت کا حامل ہے، اِس موضوع میں پائی جانے والی معمولی غلطیاں بھی نتائج اور مآل کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہوجاتی ہیں، اِسی لیے معاصرین کے برخلاف، متقدمین حضرات کے ہاں اِس سلسلے میں حد درجہ احتیاط پائی جاتی ہے۔

اِس موضوع پر اُصولِ حدیث کی کتابوں میں ضمناً گفتگو کی جاتی ہے، حافظ ابن دقیق العیدؒ نے ''الاقتراح'' میں کچھ تفصیل کے ساتھ اِس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، پھر علامہ تاج الدین السبکی الشافعیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''طبقات الشافعیۃ الکبریٰ'' میں (۲/۶-۲۵) مستقلاً ایک فصل قائم کرکے اِس پر گفتگو فرمائی ہے۔

پھر علامہ عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے ''الرفع والتکمیل'' خاص اِسی موضوع پر تصنیف فرمائی، جو شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی بیش قیمت تعلیقات اور زریں حواشی کے بعد ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے دو چند (بلکہ کئی چند) ہوگئی ہے۔

مگر موضوع ابھی تک تشنۂ تکمیل ہی ہے، اِسی اِحساس کے تحت موضوع سے متعلق حضرت شیخؒ کے اور دیگر علوم واِفادات کو احقر نے اپنے مقالہ ''الشيخ عبد الفتاح أبو غدة في ضوء تأليفاته وتحقيقاته'' میں بتوفیقہ تعالیٰ جمع کرنے کی کافی حد کوشش کی ہے۔

البتہ اَب تلمیذ الشیخ ابو غدۃ: محدث العصر شیخنا المبجّل شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے اِسی خلا کو پورا کرنے کے لیے ''أبحاث حديثية لتصحيح المَسارِ العلمي'' کا بہت اہم سلسلہ شروع فرمایا ہے، قبل ازیں ''الکاشف'' کے مقدمہ، اور ''تحقیق ودِراسہ'' میں، اسی طرح ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی تحقیق کے مقدمہ اور تخریج میں بھی، حضرت شیخ مدظلہ اس موضوع کے دقیق اور اہم نکات کی طرف متوجہ فرماتے رہے ہیں۔

اِسی طرح اُستاذِ محترم حضرت مولانا عبداللہ معروفی صاحب مدظلہم کا بھی یہ خاص موضوع ہے، اور احقر کو حضرت ہی کے عطا کردہ کچھ رہنما خطوط اور کچھ زبانی وتحریری اِفادات سے اِس موضوع کی طرف دل چسپی اور توجہ ہوئی ہے، فجزاهما الله عنا وعن جميع طلاب العلم والدِّين خير ما يجزي به المحسنين المخلِصين، آمین۔

اُمید کہ اِن معروضات اور تفصیلات سے موضوع کی اہمیت اور حد درجہ نزاکت کی طرف کچھ معمولی سا اِشارہ ہوگیا ہوگا، ورنہ تو آج کل حدیث شریف کے سبق میں پہنچنے سے پہلے ہی، ائمۂ حدیث اور ائمۂ فقہ پر تنقید وتعریض، بہت سے لوگوں کا سب سے پسندیدہ موضوع اور محبوب مشغلہ بن جاتا ہے، اور پھر اُن کے ''جذبۂ تحقیق'' اور ''نشترِ اصلاح'' کی زد میں کون کون آجائے؛ کچھ کہا نہیں جاسکتا، نعوذ بالله من هذا الخِذلان والحرمان۔

حالاں کہ کسی مسلمان ہی پر بلاضرورت، یا ضرورت سے زائد کوئی تنقید کرنا سخت گناہ ہے، نہ یہ کہ اُن ائمۂ اعلام اور بزرگوں سے متعلق زبان درازی کی جائے جن کے علوم ومعارف اور فیوض وبرکات سے ایک عالم منور وتاباں ہے، کسی عالم نے یہ بات کتنی اہم اور قیمتی فرمائی ہے: لا يزال طالب العلم عندي نبيلاً حتى يخوض فيما جرىٰ بين الماضين، ويَقضِي لبعضهم على بعض (قاله العلامة السبكي). [طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ۲/۲۷۸]۔

(طالب علم اُس وقت تک سعادت مند رہتا ہے جب تک گذشتہ بزرگوں کے اِختلافات میں پڑ کر، اُن کے درمیان حَکَم اور فیصل بننے کی کوشش نہ کرے)۔

اخوکم

محمد معاویہ سعدی گورکھپوری ۲۲ / ربیع الثانی ۱۴۴۰

شعبۂ تخصص فی الحدیث، جامعہ مظاہر علوم، سہارنپور

(دوسرے اور تیسرے مقصد سے متعلق گفتگو اِن شاء اللہ اگلی نشست میں)